Fikr-o-Nasar (Islamabad) 41:2 (2003)

مقدمہ پیامِ قرآن

علامہ محمد اسد ☆
ترجمہ: محمد روز خان ☆☆
نظرثانی: قیصر شہزاد ☆☆☆

تمہید

زیرِ نظر علامہ محمد اسدؒ (۱۹۰۰ء - ۱۹۹۲ء) کے محقق ترجمۂ قرآن و حواشی، ''پیامِ قرآن'' (The Message Of The Quran) کا مقدمہ ہے۔علامہ مرحوم اس وقت آسٹرین سلطنت میں شامل پولینڈ کے شہرلوو کے ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام لیوپولڈ ویس (Leopold Weiss) رکھا گیا۔ ۱۴ برس کی عمر میں گھر سے بھاگ کر عالمی جنگ اوّل میں حصہ لینے کے لئے آسٹرین فوج میں بھرتی ہوگئے۔ ۱۹۲۲ء میں یورپ کے ایک ممتاز ترین اخبار کے بین الاقوامی نامہ نگار برائے مشرقِ قریب و بعید بنے۔ ایک صحافی کی حیثیت سے انہیں فلسطین، مصر، شام، عراق، ایران، اردن، سعودی عرب اور افغانستان کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ اس طرح انہیں عالمی حالات خصوصاً عربوں اور یہودیوں سے متعلق بے شمار معلومات ملیں۔ یروشلم میں یہودی مجلسِ عمل کے روّیے نے انہیں متنفر کر دیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہودی مہاجرین کی بیرونی قوت کی مدد سے فلسطین پر قبضے کے لئے تگ و دو سراسر ناجائز اور زیادتی پر مبنی ہے اس کی تفصیل انہوں نے اپنی کتاب Road To Makka (شاہراہ مکہ) میں دی ہے۔ عالم اسلام میں سفر نے اسلام میں آپ کی دل چسپی میں اضافہ کیا۔ آپ ۱۹۲۶ء میں دامنِ اسلام سے وابستہ ہوگئے اور یوں مسلم نشاۃِ ثانیہ آپ کا مقصدِ حیات بن گئی۔ اس مقصد کے لئے آپ نے لیبیا کے صحرا سے پامیر تک اور باسفورس سے لے کر بحیرۂ عرب تک کے بادشاہوں، رہنماؤں اور عام لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے اپنے خیالات عالیہ اپنی کتاب Islam At Cross Roads (اسلام چوراہے پر) میں پیش فرمائے۔ ہندوستان میں آپ کی

☆ ممتاز محقق و مترجم قرآن

☆☆ 7EV -۳۳ ، واہ کینٹ

☆☆☆ لیکچرر / ریسرچ ایسوسی ایٹ ، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

دوستی علامہ محمد اقبال سے ہوگئی۔ حضرتِ اقبال نے آپ کو اسلامی سلطنت کے خدوخال نمایاں کرنے کی ترغیب دی۔ وسطی امریکہ سے شائع ہونے والے سہ ماہی مجلّہ ''اقراء'' کے مدیر جناب حسن ظل الرّحیم نے، جن کی موصوف سے خط و کتابت بھی رہی، اسد مرحوم کے تفصیلی حالات لکھے ہیں۔ جناب حسن کی نہایت قابل توجہ تحریر کے یہ جملے پیش ہیں: ''ہمارے وقتوں میں کسی ایک نے بھی فہمِ اسلام، بیداریٔ مسلماناں اور شرق و غرب کے درمیان تعمیرِ رابطہ کے لئے محمد اسدؒ سے زیادہ حصہ نہیں لیا اور محنتِ شاقہ نہیں کی---'' وہ تادم آخر پراُمید رہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل ان کے خواب کو حقیقت کا روپ دینے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوگی''۔ آپ سپین میں دفن ہیں۔

آپ کی انگریزی زبان دانی کے محاسن کی کماحقہ اور مفصل داد تو کوئی اہل زبان ہی دے سکتا ہے تاہم اتنا نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی تحریر خلوص، خود اعتمادی اور تبحر اسلامی کا شاہکار ہے۔ اگر مقدمہ میں پیش کردہ رموزِ لسانیات، دیگر نظریات سے تقابل، فصاحت و بلاغت اور ترنمِ قرآن اور ایجازِ قرآن کے حوالہ سے بات کی جائے تو قدم قدم پر نکات کا اژدہام متلاشیانِ علم و دانش کے فکر و نظر کے لئے وافر سامان مہیا کرتا ہے۔ اس بات کا جاننا کہ مغرب نے قرآن اور اسلام کو صحیح معنوں میں کیوں نہ سمجھا، عہدِ حاضر کے احوال و ظروف میں مزید اہم ہو جاتا ہے۔ ترجمۂ قرآن کے لئے انہوں نے جو بیش قیمت ہدایات دی ہیں وہ دنیا کی کسی بھی زبان میں قرآن کی افہام و تفہیم کے لئے ناگزیر ہیں۔

نفسِ مضمون

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے انسان کو ایک جراثیمی خلیہ سے، پڑھ جس نے (انسان کو) قلم کا استعمال سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا''۔

سورۃ نمبر ۹۶ کی ان پہلی اور آخری (اپنے نزول کی زمانی ترتیب کے لحاظ سے پہلی اور آخری) آیات[1] کے ساتھ انسان کی کمزور حیاتیاتی ابتداء نیز اس کے شعور و ذہانت کے اشارۃً ذکر کے ساتھ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں رسول (مقبول) محمد (ﷺ) کی طرف قرآن (کریم) کی اس وحی کا آغاز ہوا جس نے آپ کی رسالت کے ۲۳ سالوں تک جاری رہنا تھا اور آپ کے وصال سے تھوڑا قبل سورۃ نمبر۲ کی آیت نمبر ۲۸۱ کے ساتھ ختم ہونا تھا۔

''اور خبردار رہو (ڈرو) اس دن سے جس دن تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا جس دن

بنی نوع انسان کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کے ساتھ ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

ان پہلی اور آخری آیات کے درمیان (اپنے نزول کی تاریخ وار ترتیب کے لحاظ سے) اوّل و آخر ایک کتاب کھلتی ہے جس نے ہماری دانست میں دنیا کی سیاسی، سماجی اور دینی تاریخ کو کسی بھی دوسرے مظہر سے زیادہ بنیادی طور پر متاثر کیا ہے۔ کسی دوسرے مقدس نوشتہ نے کبھی بھی اپنے معتقدین اور پہلے مخاطبین کی زندگیوں، انکے اور انکی نسلوں کے ذریعے، پورے تہذیبی دھارے پر ایسا فوری اثر نہیں کیا۔ اس نے عرب کو ہلا کر رکھ دیا اور مسلسل برسر پیکار قبائل کو ایک قوم بنا دیا، چند ہی عشروں کے دوران اپنا عالمی نکتہء نظر عرب کی حدود سے بہت پرے پہنچا دیا اورانسانی معلومات کی حد تک، پہلا نظریاتی معاشرہ قائم کیا۔ علم و آگہی پر زور دے کر اس نے اپنے پیروکاروں میں فکری تجسس اور آزادانہ تحقیق کی روح بیدار کر دی جو بالآخر تعلیم اور سائنسی تحقیق کے ایک ایسے عظیم الشان دور پر منتج ہوئی جس نے عالمِ اسلام کو اپنے ثقافتی دم خم کے عروج پر ممتاز ترین مقام دلوایا۔

اس طرح قرآن کی پروردہ ثقافت بے شمار چھوٹی بڑی راہوں سے قرونِ وسطیٰ کے یورپی ذہن میں سرایت کرگئی اور ثقافتِ مغرب کے اس احیاء جسے ہم نشاۃ ثانیہ کا نام دیتے ہیں اور، اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی حد تک، اس دور کی پیدائش کی ضامن بنی، جسے سائنسی دور کہتے ہیں۔ وہ دور جس میں ہم اب رہ رہے ہیں۔

یہ سب فقط پیامِ قرآن کے باعث اِن لوگوں کے ذریعے ہوا جنہیں اس نے تحریک دی اور اپنی تمام اقدار کی تعیین کے لئے ایک بنیاد اور تمام دنیاوی مساعی کے لیے ایک سمت مہیا کی کیونکہ بشمول بائبل کوئی کتاب مقابلتًا اتنی وابستگی اور احترام کے ساتھ نہیں پڑھی گئی اور نہ ہی کسی دوسری کتاب نے کبھی لوگوں کی اتنی زیادہ زیادہ تعداد کو اتنے لمبے عرصے تک اس استفسار کا کہ'' مجھے اس دنیا میں اچھی زندگی گزارنے اور آنے والی زندگی میں حصولِ مسرّت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟'' ایسا جامع جواب دیا۔ بعض مسلمانوں نے اس جواب کو کتنی ہی مرتبہ غلط کیوں نہ سمجھا ہو اور ان میں سے کچھ لوگ اس پیام کی روح سے کتنے ہی دور کیوں نہ ہٹ گئے ہوں، یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ ان تمام افراد کے نزدیک جو قرآن پر یقین رکھتے تھے اور رکھتے ہیں یہ انسان پر فضل الٰہی کے حتمی اظہار، حتمی دانائی ، حتمی حسنِ بیان اور اللہ کے سچے کلام کی نمائندگی کرتا ہے۔

مسلمانوں کا قرآن کی جانب یہ رجحان بطور اصول اس مغربی باشندے کو حیران کر دیتا ہے جو

بہت سے موجودہ تراجم میں سے کسی ایک کے ذریعے قرآن تک پہنچتا ہے۔ جہاں ایک مومن کو قرآنِ پاک عربی میں پڑھتے ہوئے حسن نظر آتا ہے غیر مسلم اکثر ناپختگی پانے کا دعویٰ کرتا ہے قرآنی نقطۂ نظر کی ہم آہنگی اور انسانی صورت حال کے ساتھ اس کی مطابقت بالکل اس کے ذہن سے نکل جاتی ہے بلکہ ایسا روپ اختیار کر لیتی ہے جسے یورپی اور امریکی استشراقی ادب میں عام طور پر بے ربط گفتگو (incoherent rambling) جاتا ہے۔[۲] اورایک مسلم کے نزدیک جو پیرے عظیم الشان حکمت کے بیان پر مشتمل ہوتے ہیں،وہ اکثر مغربی سامع کو پھیکے اور غیرمتاثر کن معلوم ہوتے ہیں، اس کے باوجوداس امر سے قرآن کے بہت مخالف نقادوں نے بھی کبھی انکار نہیں کیا کہ درحقیقت یہ (قرآن) لاکھوں لوگوں کے لیے، مذہبی اور ثقافتی دونوں معنوں میں، اعلیٰ ترین تحریک کا منبع رہا ہے۔ (مغربی قارئینِ قرآن کے ہاں پائے جانے والے)اس ظاہری تناقض کی وضاحت کیسے کی جا سکتی ہے؟۔

اس بات کی بہت زیادہ آسانی سے وضاحت اس نہایت سطحی دلیل کے ذریعے نہیں کی جاسکتی جسے بہت سے جدید مسلمان بخوشی تسلیم کر چکے ہیں کہ قرآن کو اس کے مغربی مترجمین نے جان بوجھ کر غلط انداز میں پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بڑی یورپی زبانوں کے تقریباً تمام موجود ترجموں میں سے کئی کا باعث ،خصوصاً پرانے زمانے میں ،کینہ ورانہ تعصب اور گمراہ مشنری جوش بنا، پھر بھی سنجیدہ علماء کی تحقیقی کاوشوں کے نتیجہ کے طور پر سامنے آنے والے چندتازہ ترین تراجم پر بمشکل ہی شک کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے شعوری جانبداری سے مشتعل ہوئے بغیر دیانت داری سے عربی متن کے مفہوم و معانی کی کسی یورپی زبان میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مزید برآں مسلمانوں کے بہت سے جدید ترجمے موجود ہیں جن کے بارے میں ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے تخیل کی کسی کھینچ کھانچ سے فرض نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے ہاں مسلّمہ مقدس وحی کو غلط طور پر پیش کیا ہے،اس کے باوجود ابھی تک ان میں سے کوئی ایک ترجمہ بھی ،خواہ مسلمانوں نے کئے ہوں یا غیر مسلموں نے، قرآن کو ایک مختلف مذہبی یا نفسیاتی ماحول میں پروان چڑھنے والوں کے قلوب و اذہان کے قریب نہیں لاسکا اور نہ اس (قرآن) کی حقیقی گہرائی اور دانش کا کچھ بھی انکشاف ہی کرسکا ہے۔یہ کسی حد تک اسلام کے خلاف شعوری اور غیر شعوری تعصب کی وجہ سے ہو سکتا ہے، جو مغربی ثقافتی نظریات میں صلیبی جنگوں کے وقت سے سرایت کیے ہوئے ہے۔ یہ (تعصب) اس فکر و احساس کا غیر محسوس ورثہ ہے جس نے ایسی تمام اشیاء کے بارے میں جو کسی حد تک اسلامی ہوں نہ صرف مغرب میں بسنے والے عام آدمی بلکہ معروضی تحقیق میں لگے ہوئے علماء پر بھی لطیف تر انداز میں اپنے

رجحان کے نشان چھوڑے ہیں۔ لیکن یہ نفسیاتی عامل بھی مغرب میں دنیائے اسلام سے متعلق ہر شئے کے ساتھ ناقابلِ تردید اور روز افزوں دل چسپی کے باوصف قرآن کی قدردانی کی کمی کی مکمل وضاحت کافی طور پر نہیں کرتا۔ یہ (بات) محض قیاس آرائی کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہے کہ اس قدردانی کی کمی کی ایک بڑی وجہ قرآن کے اس پہلو میں ملنی چاہئے جو اس کو بنیادی طور پر دوسرے مقدس نوشتوں سے ممتاز کرتا ہے اور وہ ہے اس کا عقل پر ایمان کی طرف لیجانے والے صحیح راستے کے طور پر، نیز وجودِ انسانی کے روحانی وجسمانی (اور اسی طرح سماجی) معاملات کی عدم علیحدگی، انسان کے روزمرہ اعمال اور ہر طرح کے دنیاوی رویوں کا حیات و تقدیرِ روحانی کے ساتھ ربط ضبط پر اصرار ہے۔

حقیقت کی روحانی اور جسمانی شعبوں میں تقسیم کا فقدان ان لوگوں کے لئے قرآن کی سب مذہبی سوالات تک مبنی برعقل رسائی کی قدردانی کرنا مشکل بنا دیتا ہے جو مبینہ طور پر ہر سچے مذہبی مشاہدہ میں موجود جبلی ، مافوق الفطرت عنصر پر زور دینے والے دوسرے ادیان کے مدار میں پلے بڑھے ہوں چنانچہ قرآن کا معاملاتی قانون سازی کو روحانی تعلیمات کے ساتھ مسلسل وابستہ کرنا اس مغربی قاری کو متحیر کر دیتا ہے جو مذہبی تجربے کو پوشیدہ اور تمام بالائے ادراک اشیاء کے سامنے ایک تقدس آمیز سنسنی خیزی کا احساس تصور کرنے کا عادی ہو چکا ہے اور اچانک اس کا سامنا قرآن کے اس دعوی سے ہو جاتا ہے کہ وہ نہ صرف آخرت سے متعلق روحانی اچھائی کا رہبر ہے بلکہ وہ روحانی، جسمانی اور سماجی طور پر بھی اس دنیا میں ممکن الحصول اچھی زندگی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ الغرض مغربی قاری قرآن کے (اس) دعویٰ کو بخوشی قبول نہیں کر سکتا کہ تمام زندگی عطیہ الٰہی ہونے کے ناطے ایک وحدت ہے اور یہ کہ جسم و ذہن، جنس و اقتصادیات، انفرادی پارسائی اور سماجی مساوات کے تمام مسائل ان آرزوؤں سے قریبی طور پر منسلک ہیں جن پر انسان بجا طور پر اپنی حیات بعدالموت کے حوالے سے غور کرنے پر آمادہ ہو۔ یہ میری رائے میں قرآن اور اس کی تعلیمات کی جانب اکثر مغربیوں کے منفی اور کم فہمی کے رجحان کی وجوہات میں سے ایک ہے۔ لیکن اب بھی ایک دوسری ، اور شاید زیادہ فیصلہ کن، وجہ اس امر میں پائی جا سکتی ہے کہ قرآن کو کسی یورپی زبان میں صحیح معنوں میں قابل فہم انداز میں ابھی تک پیش ہی نہیں کیا گیا ۔

قرونِ وسطی کے دورِ عروج کے لاطینی تحقیقی کاموں کے آغاز سے لے کر عہدِ حاضر تک تقریباً تمام یورپی زبانوں میں کیے گئے تراجم کی ایک طویل فہرست دیکھتے ہوئے ہمیں تمام مصنفین میں خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ایک قدرِ مشترک یہ ملتی ہے کہ وہ تمام لوگ ایسے تھے، یا ہیں، جنہوں نے عربی زبان کا اپنا علم صرف تقلیدی مطالعہ یعنی کتب سے حاصل کیا۔ ان میں کوئی ایک بھی ،خواہ اس کی علمیت

کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، عربی زبان سے ایسی واقفیت نہیں رکھتا جو ایک شخص اپنی زبان سے رکھتا ہے جس نے محاورہ کی باریکیوں اور اسالیب کو فعّالانہ اور ہمدردانہ اثرپذیری کے ساتھ اپنے اندر جذب کر لیا ہو اور اسے جملوں اور الفاظ کی صوتی رمزیت کے مدّعاء سے ہم آہنگ ہو کر بے ساختہ قبول کرنے والا ہو۔ کیوں کہ کسی بھی زبان کے الفاظ اور جملے ان لوگوں کے درمیان رسمی اور تحت الشعوری طور پر متفق علیہ مفاہیم کی علامات ہوا کرتے ہیں ،جو اس خاص زبان کے ذریعے اپنا ادراکِ حقیقت بیان کرتے ہیں۔ جب تک کوئی مترجم زیر بحث زبان کی ادراکی علامت اپنے باطن میں دوبارہ پیدا کرنے کا اہل نہیں ہوتا یعنی جب تک وہ اسے فطری پن اور بلاواسطہ اپنے کانوں میں آواز دیتا ہوا محسوس نہیں کرتا، اس کا ترجمہ اس ادبی مواد کے خارجی خول سے زیادہ کا ابلاغ نہیں کر سکتا جس کے لئے اس کا تحقیقی کام وقف ہے اور وہ اصل کے باطنی مفہوم سے کم و بیش ہٹ جائے گا اور جتنا کہ اصل (متن) عمیق ہوگا ایسا ترجمہ اس کی روح سے اتنا ہی دور ہو جائے گا۔

بلاشبہ قرآن کے بعض مترجمین کو، جن کے تحقیقی کام مغربی عوام کی رسائی میں ہیں اس مفہوم میں منفرد علماء کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے عربی گرائمر میں مہارت حاصل کی ہے اور ادب عربی کا معتدبہ علم حاصل کیا ہے لیکن فی نفسہ گرائمر کی یہ مہارت اور ادب سے یہ شناسائی مترجم کو عربی (اور خصوصاً قرآنی عربی) سے ترجمہ کی صورت میں زبان کی روح کے اس غیر محسوس قرب سے مستغنی نہیں ٹھہرا سکتی جو اس زبان کے ذریعے اور اس (کے بولنے والوں) میں رہ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

عربی ایک سامی زبان (Semitic Tongue) ہے، دراصل یہ ایک سامی زبان ہے جو ہزاروں سال تک تسلسل کے ساتھ زندہ رہی ہے بلکہ پچھلی چودہ صدیوں سے مکمل طور پر غیر متغیر رہنے والی واحد زندہ زبان یہی ہے یہ دو عوامل ہمارے زیر بحث معاملہ کے نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں ۔چونکہ ہر زبان اپنے بولنے والوں کے اقدارِ حیات کے مخصوص فہم اور ان کے ادراکِ حقیقت کے مخصوص اسلوبِ اظہار کی نمائندگی کرنے والی علامتوں کا نظام ہوتی ہے، عربوں کی زبان، اتنی صدیوں سے غیر متغیر رہنے والی ایک سامی زبان، کو واضح طور پر اس چیز سے لازماً مختلف ہونا چاہئے جس کا ذہنِ مغرب خوگر ہے۔ عربی محاورہ کا کسی یورپی محاورہ سے مختلف ہونا محض اس نحوی ساخت اور اسلوب کا معاملہ نہیں جن میں یہ اپنے افکار پیش کرتی ہے اور نہ یہ محض عربی گرائمر کی معروف اور اپنے افعال کے مادّوں کے مخصوص نظام اور ان مادّوں سے ممکن الحصول بے شمار شکلوں سے ابھرنے والی انتہائی لچک کے باعث ہے، حتیٰ کہ یہ عربی زبان کے الفاظ کی غیر معمولی فراوانی کے باعث بھی نہیں۔ بلکہ یہ تو روح اور ذوقِ حیات کا معاملہ ہے اور چونکہ قرآن کی عربی ایسی زبان ہے جس نے چودہ

صدیاں قبل مکمل پختگی حاصل کی لہذا اس کی روح کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے اس زبان کو ویسے ہی محسوس کرنے اور سننے کا اہل ہونا چاہئے جس طرح عربوں نے اس وقت محسوس کیا اور سنا جب قرآن نازل کیا جا رہا تھا اور وہ مفہوم جو انہوں نے ان لسانی علامتوں کو دیا جن میں یہ (زبان) بولی جاتی ہے۔

ہم مسلمانوں کا ایمان ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے جو رسول (مقبول حضرت) محمد (ﷺ) پر انسانی زبان کے ذریعہ نازل کیا گیا اور یہ جزیرہ نمائے عرب کی زبان تھی۔ ایک ایسی قوم کی زبان جسے اس خاص زودفہمی سے نوازا گیا تھا جو صحرا، اس کا لمس وسعت اور ازلی پہنائیاں اپنے بچوں کو عطا کرتے ہیں۔ جن کے تخیلات کوشش کے بغیر ایک ارتباط(association) سے دوسرے ارتباط تک رواں دواں یکے بعد دیگرے تیز رفتاری سے پیش قدمی کرتے ہیں اور جو اکثر ماقبل سے منسلک رہتے ہوئے مضمر مابین کو ایجازاً پھاند جاتے ہیں۔ ''ایجاز''عربی محاورہ اور چنانچہ لغتِ قرآنی کا اس حد تک لازمی امتیازی وصف ہے کہ اپنے اندر جبلی طور پر اسی طرح کے ایجاز اور مربوط فکر کی تخلیقِ مکرّر کی صلاحیت کے بغیر اس کا اسلوب اور باطنی مفہوم سمجھنا ناممکن ہے۔ اب یہ اہلیت ایک تعلیم یافتہ عرب میں اس کے اوائل طفولیت ہی سے ذہنی تربیت کے تدریجی عمل کے ذریعے تقریباً از خود آ جاتی ہے کیونکہ جب وہ اپنی مادری زبان صحیح طریقہ سے بولنا سیکھ لیتا ہے تو وہ تحت الشعوری طور پر ایسا فکری سانچہ حاصل کر لیتا ہے جس میں اس (زبان) نے ارتقاء پایا ہے اور اس طرح غیر محسوس طور پر اس فکری ماحول میں نشوونما پاتا ہے جس سے عربی زبان اپنی خاص ہیئت اور اسلوبِ اظہار اخذ کرتی ہے تاہم ایک غیر عرب کے لئے جو عربی زبان کو ایک شعوری کوشش کے نتیجے میں مثلاً مطالعہ کے ذریعے صرف پختہ عمر میں حاصل کرتا ہے ایسا نہیں کیونکہ جو کچھ وہ حاصل کرتا ہے وہ صرف مبتذل خارجی ڈھانچہ ہوتا ہے جو عربی محاورہ کو باطنی حیات اور حقیقت عطا کرے والے غیر محسوس وصفِ ایجاز سے خالی ہوتا ہے۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک غیر عرب اصل روح کے مطابق عربی زبان کبھی نہیں سمجھ سکتا، بلا کم و کاست اس بات کا مطلب یہ ہے کہ وہ محض تقلیدی مطالعہ کے ذریعہ اس کی حقیقی مہارت حاصل نہیں کر سکتا مزید برآں اسے لسانیاتی علم کے علاوہ زبان کے جبلی لمس کی بھی ضرورت ہے اب ہوتا یوں ہے کہ ایسا لمس محض شہروں میں رہائش پذیر جدید عربوں کے درمیان رہ کر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہے ان میں سے کئی لوگوں نے، خاص طور پر خواندہ حضرات، اپنی زبان کی روح کو تحت الشعوری طور پر جذب کر لیا ہو اس کے باوجود وہ اسے کسی نووارد تک شاذ و نادر ہی پہنچا سکتے ہیں۔

وجہ سادہ سی ہے کہ ان لوگوں کی لسانیاتی تعلیم کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، ان کی روزمرہ کی گفتگو صدیوں کے دوران زیادہ تر بگڑ چکی ہے اور قدیم عربی زبان سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ یوں عربی زبان کا مطلوبہ احساس حاصل کرنے کے لئے ایک غیر عرب کو ضرور ان لوگوں سے طویل اور قریبی رابطہ میں رہنا چاہئے جن کی روزمرہ کی گفتگو ان کی زبان کی اصل روح کی عکاسی کرتی ہے اور جن کے ذہنی تعاملات اس وقت کے عربوں سے مشابہ ہیں جب عربی زبان نے اپنا حتمی رنگ اور باطنی ہیئت حاصل کی۔ ہمارے دور میں ایسے لوگ صرف جزیرہ نمائے عرب ، خصوصاً وسطی اور مشرقی عرب کے بدو ہیں کیونکہ ،لہجے سے متعلق بہت سی مخصوص باتوں میں کلاسیکی قرآنی عربی سے ان لوگوں(کی زبان) کے ممکنہ اختلاف کے باوجود، یہ (بدوی زبان) دورِ رسالت کے محاورہ سے زیادہ قریب تر رہی ہے اور اس نے اس کی تمام حقیقی خصوصیات کو محفوظ رکھا ہے۔[۳] بالفاظِ دیگر،کلاسیکی عربی زبان کے روایتی علم کے علاوہ،ہمارے زمانے کے ایک غیر عرب کے لئے قرآن کے انتخاب و استعمالِ الفاظ کا قریبی فہم حاصل کرنے کا بلاشبہ واحد راستہ وسطی اور مشرقی عرب کی بدوی گفتگو سے واقفیت ہے اور چونکہ ان علماء میں سے جنہوں نے عرصہء گزشتہ میں قرآن کا یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا ، کبھی بھی اس پیشگی شرط کو پورا نہیں کیا چنانچہ ان کے تراجم ناقص اور اس کی روح و معانی کی بازگشت سے بعید ہی رہے ہیں۔

جو کام میں اب عوام کے سامنے رکھ رہا ہوں، زندگی بھر کے مطالعہ اور عرب میں گزارے کئی سالوں پر مبنی ہے یہ کسی یورپی زبان میں قرآنی پیام کے صحیح معنوں میں تشریحی ترجمہ کی شاید پہلی کوشش ہے تاہم میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اس مفہوم میں قرآن کا ترجمہ کر دیا ہے جس میں، مثلاً افلاطون یا شکسپیئر کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے، کسی دوسری کتاب کے برعکس اس (قرآن) کے معانی اور لسانی پیشکش ایک اٹوٹ وحدت بناتے ہیں۔ جملے میں مفرد الفاظ کا مقام، اس کی تراکیب کا ترنم اور صوتی تاثر ،ان کی نحوی ترکیب،وہ انداز جس میں استعارہ ایک جملے میں تقریباً غیر محسوس انداز میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ صوتیاتی زور کا نہ صرف اظہارِ بلاغت بلکہ غیر ملفوظ، مگر واضح، مضمر تصورات کی طرف اشارہ کرنے میں استعمال، یہ سب کچھ قرآن کو بالآخر بے نظیر اور ناقابل ترجمہ بنا دیتا ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی طرف پرانے مترجمین اور تمام علمائے عرب نے اشارہ کیا ہے۔ لیکن اگرچہ قرآن کو کسی دوسری زبان میں کماحقہ دوبارہ پیش کرنا ناممکن ہے تاہم اس کے پیام کا ترجمہ ایسے لوگوں کے لئے قابل فہم بنانا ممکن ہے جو بہت سے اہل مغرب کی طرح عربی زبان قطعاً نہیں جانتے یا جیسا کہ بہت سے تعلیم یافتہ غیر عرب مسلمانوں کا حال ہے، جو اس (زبان) کے ذریعے بغیر کسی مدد کے اپنی راہ تلاش کرنے کے بہت زیادہ اہل نہیں ہوتے۔

اس مقصد کے لئے ایک مترجم کو نزولِ قرآن کے وقت سے رائج لسانیاتی استعمال کے ذریعےاول تا آخررہنمائی حاصل کرنی چاہئے اور یہ بات اسے ہمیشہ ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ اس کی بعض تعبیرات خصوصاً جن کا تعلق تصوراتِ مجردہ سے ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوامی ذہن میں ایک لطیف تغیر کے عمل مجرد سے گزرے ہیں لہذا غیر مادی تصورات کا ترجمہ اس معنی میں نہیں کیا جانا چاہئے جو انہیں مابعد کلاسیکی دور کے استعمال میں دیا گیا ہے۔ جیسا کہ عظیم مسلمان عالم محمد عبدہ" (۴) نے اشارہ کیا ہے زباندانی کے اعتبار سے بعض مستند مفسرینِ قرآن علماء نے بھی کبھی کبھار اس سلسلہ میں غلطی کی ہے اوران کی اغلاط نے، جدید مترجمین کو اپنی کم اہلی کے باعث اور بھی بڑھ کر، تحریف اور بعض اوقات انکے یورپی زبانوں میں تراجم کے دوران قرآن کے مفرد پیروں کے مکمل عدم فہم تک لا چھوڑا۔

ایک اور اتنا ہی اہم نقطہ جس کا مترجم کو مکمل خیال رکھنا چاہئے ایجازِ قرآن ہے۔ یعنی وہ ناقابلِ تقلیدایجاز جو اکثر دانستہ ایک خیال کے آخری مرحلے کو انسانی زبان کی حدود میں رہتے ہوئےممکن اختصار سے بیان کرنے کے لیے متعلقہ درمیانی چھوٹی جملے کو حذف کر جاتا ہے ۔یہ طریقہ ایجاز، جیسا کہ میں نے واضح کیا ہے، عربی زبان کا ایک مخصوص لازمہ ہے جو کہ قرآن میں اپنے انتہائی کمال تک پہنچ گیا ہے۔ ایک ایسی زبان میں جو مماثل اسلوبِ ایجاز میں وظیفہ سر انجام نہیں دیتی اس کا مفہوم بیان کرنے کے لئے مترجم کو محذوف یعنی دانستہ چھوڑ دی گئی فکری کڑیوں کو قوسین میں ملحقات کے آزادانہ استعمال کی شکل میں پیش کر دینا چاہیئے کیونکہ جب تک ایسا نہ کیا جائے متعلقہ عربی ترکیب ترجمہ میں بے جان ہو کر اکثر ایک لایعنی اکٹھ بن جاتی ہے۔

مزید براں آدمی کو بہر صورت قرآن کی ان دینی اصطلاحات کا ترجمہ کرتے ہوئے ہوشیار رہنا چاہئے جو ایسے مفہوم میں استعمال ہوتی ہیں جو انہوں نے اسلام کے ایک حتمی مجموعہ قوانین و مبادی و معاملات بن جانے کے بعد حاصل کیا ہے۔ تاہم یہ باضابطگی اسلام کی دینی تاریخ کے سیاق و سباق میں کتنی ہی جائز کیوں نہ ہو یہ بات واضح ہے کہ قرآن کو محض مابعد کی نظریاتی پیش رفتوں کی روشنی میں اس کے اصل مفہوم و معانی سے نظر ہٹا کر ،جو اس میں تھے اور جو اس قوم کے لئے مراد تھے جنہوں نے پہلے پہل پیغمبر کی زبانِ مبارک سے بذاتِ خود سنا تھا، درست طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ مثلاً جب آپؐ کے معاصرین نے ''اسلام'' اور ''مسلم'' کے الفاظ سنے وہ ان اصطلاحوں کوکسی مخصوص طبقہ یا فرقہ تک محدود کرنے کے بجائے انسان کی اللہ تعالیٰ کے سامنے خود سپردگی (کے عمل)

اور سرِتسلیم خم کردینے والے لوگوں کوظاہر کرنے والی ہی سمجھے ۔ مثلاً ۳:۶۷ میں جہاں ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ کے سامنے خود سپردگی کر دینے والا(کان مسلماً) کہا گیا اور ۳:۵۲ میں جہاں یسوع (علیہ السلام) کے حواریوں نے کہا گواہ رہو کہ ہم نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے (بانا مسلمون)۔ عربی زبان میں یہ حقیقی مفہوم محفوظ رہا ہے اور کوئی عرب عالم ان اصطلاحات کے وسیع تضمن سے کبھی غافل نہیں رہا تاہم ہمارے عہد کے مسلم اورغیر مسلم عجمیوں کے ہاں''اسلام'' اور ''مسلم'' یکساں طور پراکثر مخصوص اور تاریخی اعتبار سے محدود معنی رکھتے ہیں اور خالصتاً پیغمبر اسلام (حضرت) محمد (ﷺ) کے پیروکاروں پر لاگو ہوتے ہیں۔ اسی طرح ''کفر'' (انکار حق) اور ''کافر'' (منکر حق) جیسی اصطلاحات قرآن کریم کے رسمی تراجم میں غیر مستند طور پر سادہ کر کے بالترتیب ''نہ ماننا'' ''نہ ماننے والا'' یا ''ملحد'' کر دی گئی ہیں اور یوں یہ اصطلاحات قرآن کے عطا کردہ وسیع روحانی معانی سے محروم کر دی گئی ہیں۔ ایک اور مثال لفظ ''کتاب(بمعنی قرآن)'' کے روایتی ترجمہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ نزولِ قرآن کے وقت (اور ہمیں ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ اس عمل میں ۲۳ سال لگے) اس کے سامعین نے اسے ایک کتاب کی مانند تصور نہیں کیا کیونکہ اسے پیغمبر اسلام کے وصال کے چند عشروں کے بعد مدون کیا گیا، اس کے بجائے اس نقطۂ نظر سے کہ اسم ''کتاب''''خدائی نوشتہ'' یا ''وحی'' کے معنی میں فعلِ ''کَتَبَ'' ،''اس نے لکھا'' یا'' مجازاً ''اس نے حکم دیا'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہی بات اس اصطلاح کے پہلے کی نازل شدہ کتابوں پر قرآنی اطلاق پر صادق آتی ہے۔ کیوں کہ قرآن اس بات پر اکثر زور دیتا ہے کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ الہامی نوشتہ کی وہ اوّلین مثالیں بہت حد تک بگڑ چکی ہیں اور یہ کہ موجودہ مقدس کتب دراصل حقیقی وحی پیش نہیں کرتیں۔ چنانچہ ''اہل کتاب'' کا ترجمہ ''کتاب والے لوگوں'' کے طور پر زیادہ بامعنی نہیں ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے اس اصطلاح کا ترجمہ ''اگلی وحی کے پیروکاروں'' کے طور پر کیا جانا چاہئے۔

الغرض اگر قرآن کو کسی دوسری زبان میں صحیح طور پر قابل فہم ہونا ہے تو پیام قرآنی کو بہرصورت ایسے انداز میں پیش کیا جائے جو حتی الامکان اس مفہوم سے قریب تر ہو جو یہ مابعد کی اسلامی نظری پیش رفت کے بوجھ سے آزاد لوگوں کے لئے رکھتا تھا۔ یہ وہ راجح اصول ہے جس نے تمام کام میں میری رہبری کی ہے۔

دو اصطلاحوں کے علاوہ میں نے بہت کوشش کی ہے کہ ہر قرآنی فکر کی مناسب انگریزی تعبیروں میں منطقی تعریف پیش کروں۔ یہ ایسی کوشش ہے جو بعض اوقات کسی مفرد عربی لفظ کے مفہوم کے ابلاغ کے لئے پورے جملے کا استعمال ضروری بنا دیتی ہے۔ اس ضابطہ سے دواصطلاحات ''القرآن'' اور

''سورۃ'' مستثنیٰ ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی ایک بھی کبھی عربی میں اس مخصوص الہامی نوشتہ اور اس کے اجزاء یا ابواب (بالترتیب) کو ظاہر کرنے کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال نہیں کی گئیں نتیجتاً ان دو اصطلاحات کے تراجم کو قاری کے سامنے کیسے بھی پیش کیا جاتا، کوئی فائدہ نہ تھا۔(۵)

ان لسانی ملحوظات کے علاوہ میں نے کوشش کی ہے کہ ترجمہ کے ان دو بنیادی اصولوں کو مسلسل مدنظر رکھوں:

-- اوّل: قرآن کو علیحدہ علیحدہ احکامات اور نصائح کا مجموعہ قطعاً خیال نہ کیا جائے بلکہ اس کو ایک ناقابل تقسیم وحدت سمجھا جائے یعنی ایک اخلاقی اصول کا ایسا بیان جس میں ہر آیت اور جملہ دوسری آیات اور جملوں سے ایک بہت گہرا تعلق رکھتا ہے جن میں سے سب ایک دوسرے کی وضاحت اور ایک دوسرے کو اجاگر کرتے ہیں چنانچہ اس کے حقیقی معانی صرف اس وقت گرفت میں آ سکتے ہیں جب ہم اس کے جملوں میں سے ہر ایک کو اس کے صفحات میں کسی دوسری جگہ کے بیانات سے جوڑیں اور اس کے افکار کو مربوط حوالہ جات کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کریں اور ہمیشہ خاص کو عام اور عارضی کو جوہری اصل کے ماتحت لائیں۔ جب بھی خلوص کے ساتھ اس اصول کی پیروی کی جائے ہمیں محسوس کر لیتے ہیں کہ قرآن، بقول محمد عبدہ اپنا بہترین شارح خود ہے۔

-- دوئم: قرآن کے کسی حصہ کو خالصتاً تاریخی نکتہ نظر سے نہیں لینا چاہئے یعنی تمام تاریخی حالات و واقعات، بشمول عہدِرسالت اور زمانہء ماقبل، کی طرف اس کے حوالہ جات، کو ضرور انسانی احوال کی توضیح خیال کرنا چاہئے نہ کہ بجائے خود ایک مقصد۔

لہذا کسی خاص آیت کے نزول کے تاریخی موقع کے لحاظ کو، جو کلاسیکی مفسرین کی من بھاتی جستجو رہی ہے، آیت مذکورہ کی تہ میں موجود اس مفہوم اور اصولی تعلیم کے باطنی ربط کو دھندلانے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے قرآن بحیثیت مجموعی پیش کرتا ہے۔

اپنی بہترین صلاحیت کی حد تک قرآنی پیام کے بے شمار پہلوؤں کو واضح کرنے کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اپنے ترجمہ پر بہت سے توضیحی حواشی کا اضافہ کروں۔ قرآنی رمزیت اور عقیدۂ جرم و سزا سے متعلق تھوڑے بہت اظہار ہائے خیال کو علیحدہ اس تحقیقی کام کے ضمیمہ نمبرا میں نمٹایا گیا ہے۔میں نے حواشی اور ضمیمہ جات دونوں میں پیام قرآن کو واضح کرنے سے زیادہ کوئی کوشش نہیں کی اور اس غرض سے میں نے بڑی حد تک عظیم عربی ماہرین لسانیات اور اعلیٰ پائے کے مفسرین کے تحقیقی کاموں پر انحصار کیا ہے۔ اگر کسی موقع پر میں نے اپنے آپ کو متاخرین کی پیش کردہ ترجمانیوں سے

اختلاف پر مجبور پایا ہے تو قاری کو یاد رہے کہ قرآن کی اصل انفرادیت اس حقیقت پر مشتمل ہے کہ جتنا ہمارے دنیاوی علم اور تاریخی تجربہ میں اضافہ ہوگا اتنے ہی مستند معانی خودکو قرآن کے صفحات میں منکشف کریں گے۔

ہمارے ماضی کے عظیم مفکرین اس مسئلہ کو مکمل طور پر اور بخوبی سمجھتے تھے۔ اپنی تفاسیر میں وہ اپنی فکر کے ساتھ قرآن تک آئے۔ یعنی انہوں نے قرآن کے ہر بیان کے مفہوم کو عربی زبان کے اپنے عظیم الشان علم اور سنتِ نبوی سے حاصل کردہ تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں نیز دستیاب معلوماتِ عامہ کے ذخیرہ اور تاریخی اور ثقافتی تجربہ، جس نے ان کے وقت تک انسانی سماج کو شکل بخشی تھی، کے ذریعے وضاحت کرنے کی کوشش کی ۔لہذا یہ امر محض فطری تھا کہ وہ اسلوب جس سے ایک مفسر نے کسی خاص قرآنی جملے یا توضیح کو سمجھا، بعض اوقات اس جملے کے اپنے کسی پیش رو کے(بیان کردہ) مفہوم سے چبھنے کی حد تک مختلف ہوگیا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے اپنی تعبیرات میں اکثر ایک دوسرے کی تردید کر دی لیکن انہوں نے، تمام انسانی استدلال میں موجود اضافیتی عنصر اور ایک دوسرے کی اصابت سے پوری طرح آگاہ ہوتے ہوئے، بغیر کسی دشمنی کے ایسا کیا اور وہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے مبنی بر فراست قول سے بھی پوری طرح آگاہ تھے کہ میری امت کے علماء کے درمیان رائے کا فرق (اختلاف) اللہ کے فضل (رحمت) کا نتیجہ ہیں۔ جو واضح طور پر(اس بات پر) دلالت کرتا ہے کہ رائے کے ایسے اختلافات فکرِانسانی کی تمام پیش قدمی کی بنیاد، اور لہذا انسان کے حصولِ علم میں ایک قوی ترین عامل، ہیں۔ لیکن اگرچہ کسی بھی حقیقی اور درجہء اول کے مفسرِ قرآن نے اپنی تعبیرات کے حوالے سے کبھی بھی حتمیت کا دعویٰ نہیں کیا، اس بات پر عام طور اصرار نہیں کیا جا سکتا کہ گزشتہ صدیوں کے ان عدیم المثال اور عظیم علماء کے تحقیقی کاموں کے بغیر کسی جدید ترجمہ قرآن کا، بشمول میرے اپنے، کبھی کامیابی کی امید کے ساتھ بیڑا اٹھایا جا سکتا ہے۔ اور اسی طرح جہاں کہیں میں نے ان کی تعبیرات سے اختلاف بھی کیا ہے وہاں بھی میں ان کی علمیت کا بے حد ممنون ہوں جس نے میری تلاشِ حق کو تحریک دی ہے۔

جہاں تک میرے ترجمہ کے اسلوب کا تعلق ہے میں نے ایسے متروکات کے استعمال سے شعوری طور پر گریز کیا ہے جن کا میلان قاری کے فہم قرآن کو دھندلانے کی طرف ہوتا۔ دوسری جانب میں نے تراکیب کا خواہ مخواہ جدید محاورہ میں ترجمہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ایسا کرنا عربی متن کی روح سے متصادم ہوتا نیز تصور وحی کی لاینفک سنجیدگی سے مانوس سماعتوں پر ناگوار گزرتا۔ بایں ہمہ میں ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے قرآن کی ناقابلِ بیان فصاحت و بلاغت اور ترنم کو دوبارہ پیش کر دیا

ہے۔ جس کسی نے حقیقتاً قرآن کے حسنِ جلیل کا تجربہ کیا ہے کبھی بھی اتنا شوخ چشم نہیں ہو سکتا کہ ایسا دعویٰ کرے یا صرف ایسی کوشش کا آغاز کر سکے۔

اور مجھے پوری خبر ہے کہ میرا ترجمہ واقعتاً قرآن اور اس کے تہہ در تہہ معانی سے انصاف نہیں کرتا اور نہ کر سکتا تھا کیونکہ ''اگر تمام سمندر میرے رب کے کلمات کے لئے روشنائی ہوتے، میرے رب کے کلمات کے اختتام سے قبل ختم ہو جاتے''۔

حواشی

۱۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا ہوگا کہ اپنی آخری تدوین میں قرآن کو اس کے پیام کی مجموعی باطنی ضروریات کے مطابق مرتب کیا گیا ہے اور نہ کہ اس کی تاریخ وار ترتیب، جس میں ایک ایک کر کے سورتیں اور پیرے نازل کئے گئے تھے، کے لحاظ سے۔

۲۔ لہٰذامثلاً مغرب سے تعلق رکھنے والے ناقدینِ قرآن عموماً کسی ایک ہی ترکیب میں اللہ تعالیٰ کی طرف مبینہ غیر مربوط اشارے جیسے، وہ، اللہ، ہم، یا میں اس کے علاوہ اسم ضمیر سے مطابقت رکھنے والی تبدیلیوں کے'' اس کا'' سے ''ہمارا'' یا ''میرا'' یا ''اسے'' سے'' ہمیں'' یا ''مجھے'' کی طرف اکثر اشارہ کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نظر آتے ہیں کہ یہ تبدیلیاں حادثاتی نہیں اور نہ بالکل ایسی کہ جنہیں کوئی شاعرانہ تصرف کہہ دے بلکہ یہ واضح طور پر دانستہ(تبدیلیاں) ہیں۔ یہ ایک لسانی تدبیر ہے جس کا مطلب اس تصور پر زور دینا ہے کہ اللہ کوئی شخص نہیں اور لہٰذا محدود موجودات پر لاگو اسمائے ضمیر کے ذریعے اسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ اس (امر کی) طرف توجہ دی جانی چاہیئے کہ جدید اقتصادی حالات کے زیراثر جو بدوؤں کے قدیم طرزِ زندگی کو یکسر بدل چکے ہیں اور مدرسی تعلیم اور ریڈیو کے ذریعے ان کو شہروں کی لاونڈی ثقافت کے براہ راست رابطہ میں لے آئے ہیں، ان (بدوؤں) کی زبان کا خالص پن تیزی سے غائب ہو رہا ہے اور ہو سکتا ہے طلباء کے لئے عربی زبان کے زندہ رہنما کے طور پر بدوؤں کی زبان اپنی موجودگی ختم کر دے۔

۴۔ ایک قاری کو میرے تشریحی حواشی میں کثرت سے محمد عبدہؒ (۱۸۴۹ء-۱۹۰۵ء) کے اختیار کردہ نکتہ ہائے نظر کی طرف حوالہ جات نظر آئیں گے۔ جدید دنیائے اسلام کے سیاق و سباق میں ان کی اہمیت کی طرف کبھی بھی خاطر خواہ زور دینے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ بغیر کسی مبالغہ آرائی کے کہا جا سکتا ہے کہ معاصر اسلامی فکر کے ہر رجحان کو بالواسطہ یا بلاواسطہ واپس تمام جدید اسلامی مفکرین کے اس سرکردہ میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان کی مجوزہ اور شروع کردہ قرآنی تفسیر میں ۱۹۰۵ء میں ان کے انتقال کی وجہ سے رکاوٹ آ گئی۔ ان کے شاگرد رشید رضا نے تفسیر المنار کے عنوان سے اسے جاری رکھا (لیکن بدقسمتی سے یہ بھی نامکمل چھوڑ دی گئی) یہ تفسیر بڑی حد تک میرے زیر استعمال رہی ہے دیکھئے رشید رضا کی تاریخ الاستاذ الامام الشیخ محمد عبدہؒ (۱۳۵۰ھ-۱۳۶۷ھ) جو اب تک شائع شدہ مستند ترین سوانح حیات ہے نیز سی سی ایڈمز کی Islam And

Modernism in Egypt (London, 1933) (مصر میں اسلام اور جدیدیت، لندن ۱۹۳۳ء)

۵۔ علم الاشتقاق کی رو سے لفظ القرآن فعل قَرَءَ (اس نے پڑھا یا زبانی سنایا) سے مشتق ہے اور کامل ترین قرات کے طور پر سمجھا جائے اور جبکہ اسم ''سورۃ'' کا ترجمہ ''قدم'' (ایک اور قدم پر منتج) اور مجازاً ''درجہ میں برتر'' کیا جائے (دیکھئے Lane IV, 1465 (لین چہارم ۱۴۶۵)۔ تاہم اس پر توجہ دی جائے کہ جب اسم ''قرآن'' بغیر ''ال'' کے (نکرہ) آتا ہے تو بالعموم پڑھ کر سنانے یا گفتگو کے معنی دیتا ہے۔ اور اسی طرح ترجمہ کیا جانا چاہئے۔